تعریض کے تیر بھی رہتے تھے جو مناسب موقعوں پر استعمال کرتے اور خوب کرتے۔ حاضر دماغ حاضر جواب۔

دوستوں کی ہر طرح کی مدد کرتے، مالی بھی اور جانی بھی۔ سفارش کرنے میں بخل نہیں تھا۔ کہا کرتے سفارش تعلقات کی زکوۃ ہے قاریوں اور لکھاریوں کی مدد کرتے۔ کہاں سے کیا مواد دستیاب ہوسکتا ہے ''تابعدار جن'' کی طرح پلک جھپکتے شاہ جی وہ مواد یا کتاب مہیا فرما دیتے۔ اس علمی تعاون یا قلمی مدد پر ایک عجیب کیف وسرور ان کے چہرے پر جھلکتا بلکہ چھلکتا مگر اس احسان کو کبھی زبان پر نہ لاتے بلکہ احسان مندی کے ذکر سے محجوب ہوتے۔

مطالعہ وسیع، عمیق، متنوع اور سریع تھا یوں لگتا کتاب پڑھتے نہیں سونگھتے ہیں۔ کالم لکھے اور خوب لکھے تقاریظ اور تبصرے بھی جاندار ہوتے، لگی لپٹی نہ رکھتے کتاب یا مضمون کا جو درجہ ہوتا وہی اس کو ملتا۔

تجدُّد مآب، اباحیت زدہ، دشمنانِ دین وطن کی طرف سے جب کلوخ اندازی ہوتی تو شاہ جی کا قلم شمشیر بے نیام ہو جاتا۔ حریف کولا جواب کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کیسا ہی سورما ہوتا' شاہ جی اڑنگے میں لاکر یوں پٹخنی دیتے کہ حریف چاروں شانے چت ہوتا۔ علم، استدلال، زورِقوت، برجستگی، بے ساختگی، روانی جولانی اور طنز وظرافت ان کی تحریر کا خاصہ۔ مبدأ فیض سے شعروادب کا پاکیزہ ذوق بھی ملا تھا۔ شعر کہتے تھے مگر آزاد۔ شاید وہ اپنے فکرِ آزاد کو بحور میں مقید نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اساتذہ کے سیکڑوں اشعار نوکِ زبان تھے۔ موقع محل کی مناسبت سے یوں جڑتے جیسے انگشتری میں نگینہ۔ پھر اپنی ذہین و چمکدار نگاہیں مخاطب پر گاڑ دیتے اور داد طلب ہوتے۔ ان کی معیت میں دسیوں سفر ہوئے۔ اس بار خانقاہ سراجیہ ہم دونوں گئے تمام راستے مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی، وہاں مخدوم زادۂ گرامی مولانا عزیز احمد سے طویل گفتگو ہوئی، خوب مجلس جمی۔ یہاں یہ بلبل ہزار داستان طوطی شیریں مقال احتیاط واحترام کے دائرے میں محصور ہو جاتا۔ صاحبزادگان بھی بہت احترام سے پیش آتے، بڑی قدر فرماتے۔ حضرت والا کی مجلس میں تمام تر توجہ سمیٹ لیتے، حضرت کی نگاہِ التفات شاہ جی پر پڑتی اور خوب پڑتی، حاضرین کو رشک آتا۔ اس آخری سفر میں مجھ سے فرمایا'' آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے'' میں نے کہا شاہ جی کمال کرتے ہیں کیا پدی کی پدی کا شوربا! فرمانے لگے۔''میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو ہمارے خاندان سے تعلق ہے۔ صبیح الحسن پروان چڑھے اور علمی کام مضبوط بنیادوں پر کرلے۔ دار بنی ہاشم میں ایک شاندار منتخب ومرتب لائبریری قائم ہو۔ میں نے عرض کیا اللہ کرے کہ صبیح الحسن آپ کی توقعات سے کہیں بڑھ کر کامران وفیض رساں بنے۔ آمین۔

خانوادۂ امیر شریعت کی نیک اور سچی یادگار بھی ہماری نظروں سے روپوش ہوگئی۔ سدا رہے نام اللہ کا ہم فرقت کے ماروں کا دل سوگوار ہے۔ آنکھ اشک بار ہے مگر زباں وہی بولے گی جس کی تعلیم اللہ کے آخری نبی نے دی:

وللّٰہ ما اخذ ولہ مااعطیٰ وکل شیٔ عندہ با جل مسمی ٗ

میرا کوتاہ قلم ان کی صفات وکمالات اور خدمات کا احاطہ نہ کرسکا بلکہ کچھ بھی بیان نہ کرسکا۔ البتہ میں نے تعمیل حکم میں کوتاہی نہ کی یوں کفیل شاہ جی اور مرحوم کی روح سے شرمندہ ہونے سے بچ گیا۔

آہ! سید ذوالکفل بخاری

رؤف طاہر

ابھی تو یار طرحدار طاہر جمیل اور وضعدار و سراپا انکسار قاری شکیل کی جدائی کے زخم بھرے نہیں تھے کہ سید ذوالکفل بخاری بھی ایک گہرا گھاؤ دے گئے۔ 39 سالہ سید زادے کی اچانک رحلت کی خبر، جس نے بھی سنی، دل تھام لیا۔ ڈاکٹر عرفان ہاشمی نے فون پر تصدیق چاہی اور ہاں میں جواب پا کر بے ساختہ پکار اٹھے: ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود'' ڈاکٹر ہاشمی میں مزید کچھ کہنے سننے کا یارانہ تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں خدا حافظ ہی کہہ پائے اور فون بند کر دیا۔

تقریباً 7 سال ہوتے ہیں، سعودی وزارتِ تعلیم نے ابتدائی مدارج سے ہی سعودی بچوں کو انگریزی سکھانے کے لیے پاکستان سے لگ بھگ اڑھائی سو اساتذہ کا انتخاب کیا۔ یہ کالجوں کے نوجوان اساتذہ تھے۔ ان میں سید ذوالکفل بخاری بھی تھے جو ان دنوں ملتان کے ایک سرکاری ادارے میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ برصغیر کے بے مثل خطیب اور تحریک آزادی میں ''احرار'' کے قافلۂ سالار سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے..... لیکن یہ محض ''پدرم سلطان بود'' والا معاملہ نہیں تھا۔ ذوالکفل اپنی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ خود کو اس عظیم خانوادہ کے لائق و فائق سپوت کہلوانے کے واقعی حق دار تھے۔

سعودی عرب ملازمت کے لیے آنے والے اکثر افراد کے ذہن میں حرمین کی قربت کا خیال ہوتا ہے۔ ذوالکفل کو بھی یہی گمان تھا، لیکن یہاں ان کا تقرر منطقہ تبوک کے قصبے املج میں ہوا۔ مدینہ منورہ سے تقریباً 350 اور مکہ مکرمہ سے 500 کلومیٹر دور چند ہزار نفوس پر مشتمل یہ ساحلی قصبہ اپنی سرسبزی و شادابی کے باعث خاصا پُرکشش ہے، لیکن ذوالکفل کی تشنگی کا سبب کچھ اور تھا۔ یہاں ان کے علمی و ادبی ذوق اور تحقیق و جستجو کے شوق کا سامان نہیں تھا، جب تک فیملی پاکستان میں تھی، وہ ویک اینڈ پر عموماً جدہ کا رخ کرتے۔ نمازِ جمعہ کی حرم مکی میں ادائیگی کے علاوہ ان کا بیشتر وقت طاہر جمیل (مرحوم) کی ادبی بیٹھک میں گزرتا۔ یہاں جدہ کی علمی و ادبی شخصیات سے گفتگو رہتی۔ عمرے کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے کسی شاعر یا ادیب سے بھی یہاں ملاقات ہو جاتی۔ جدہ کے بک سٹالز پر پاکستان سے آئی ہوئی کوئی نئی کتاب دستیاب ہوتی تو اسے خرید لیتے۔ ہفتے کے باقی 5 دنوں کے لیے سیرابی کا اہتمام کر کے واپس اُملج چلے جاتے۔ وہ محکمہ تعلیم پنجاب سے ''طویل رخصت'' پر تھے۔ یوں پاکستان میں ان کی سرکاری ملازمت محفوظ و مامون تھی۔

اُملج کے چھوٹے سے قصبے میں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے اظہار اور فروغ کے لیے کچھ نہ تھا۔ کئی بار وطن

واپسی کا سوچا، پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ شاید حرمین کی قربت کی تڑپ رنگ لے آئے اور اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ 2008ء میں ان کے نالوں کا جواب آ گیا۔ مکہ مکرمہ کی اُم القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہو گیا تھا۔ اُم القریٰ یونیورسٹی میں ملازمت کے لیے نیا ویزہ اسلام آباد میں سعودی سفارت خانے سے لگنا تھا۔ انھوں نے اُملج والی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور نئے ویزے کے لیے پاکستان روانہ ہو گئے، لیکن عشق کا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ نئے ویزے میں کچھ تکنیکی مسائل حائل ہو گئے تھے۔ اس دوران ذوالکفل سے فون پر عموماً رابطہ ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا: شاہ جی! پریشانی کی کیا بات ہے، آپ کی سرکاری ملازمت محفوظ ہے، اسے جوائن کر لیں، اب تو کالج اساتذہ کی تنخواہیں بھی اچھی خاصی ہیں۔ خانوادۂ رسول ویسے بھی سیر چشم واقع ہوا ہے۔ آپ انگریزی کے استاد ہیں۔ دو تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر شام کو انگلش اکیڈمی کھول لیں۔ اس بکھیڑے میں نہ پڑنا چاہیں تو کسی پرائیویٹ ادارے میں ایک دو پیریڈ لے لیا کریں۔ آپ کے لیے ملتان ہی سعودی عرب ہو جائے گا۔

.....لیکن ذوالکفل کی تڑپ سعودی ریالوں کے لیے تو نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا ایک بار انھوں نے کہا تھا، حرمین کی قربت ان کے لیے کسی بھی نعمت، کسی بھی دولت سے بڑھ کر ہے۔ ''یوں لگتا ہے یہاں کی مٹی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' ''یہ مٹی ہے بھی تو یہیں کی۔'' میں نے جواب دیا تھا..... پھر اس سال مارچ میں ویزہ لگ گیا اور اور ذوالکفل اپنے خوابوں کی سرزمین میں واپس آ گئے۔ اب وہ بہت خوش تھے، جیسے دولت کونین مل گئی ہو۔ انھوں نے عزیزیہ میں گھر لیا، جو حرم سے پانچ سات منٹ کی مسافت پر تھا۔ یوں بھی ہوتا کہ رات کے کسی پہر دلِ بے تاب مچل اٹھتا اور ذوالکفل حرم کا رُخ کرتے۔ ڈھلتی شب کے اس پہر طواف کا اپنا لطف تھا۔ ہجوم نہ ہونے کے باعث حجر اسود کو بوسہ دینا بھی آسان تھا اور غلافِ کعبہ سے لپٹ کر دیر تک آہ وزاری میں بھی کوئی مخل نہ ہوتا۔ صحن حرم میں بیٹھ کر کعبے کو دیکھتے رہنے کا اپنا ہی لطف تھا۔ ذوالکفل ان نعمتوں سے خوب فیض یاب ہوتے۔ میں جدہ سے روانہ ہوتے ہوئے فون پر رابطہ کرتا تو حرم کے اندر یا اس کے قرب و جوار میں کوئی جگہ میٹنگ پوائنٹ کے طور پر طے پاتی۔ حرم کے اندر یا اس کے قرب و جوار میں پاکستان سے آئی ہوئی کسی علمی و ادبی شخصیت پر نظر پڑتی تو ذوالکفل اسے جا لیتے۔ یہ صورتحال ان کے لیے ''اضافی کشش'' کا باعث تھی۔

اس سال جون کے اوائل میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ساتھ ایسی ہی ایک طویل نشست میں ان سطور کے راقم کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ جدہ میں کوئی علمی و ادبی تقریب ہوتی تو ذوالکفل اس میں شرکت کا بھی اہتمام کرتے۔ انھیں نام و نمود سے حتی الامکان گریز ہوتا۔ ان کی خواہش ہوتی کہ پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر خاموشی سے استفادہ کرتے رہیں۔ احباب بہ اصرار اگلی قطار میں لاتے۔ کسی پروگرام میں ان کی تقریر ہوتی تو کامیاب ترین مقرر ہی ہوتے۔ وہ خطیب برصغیر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے تھے۔ شاہ جی کے بعد، ان کے صاحبزادگان سید عطاء المنعم بخاری، سید عطاء المحسن بخاری، سید عطاء المومن بخاری اور سید عطاء المہیمن بخاری نے بھی خطابت کی اس شمع کو روشن رکھا، لیکن ذوالکفل کی خطابت